بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دعوت الی اللہ کی باتیں ان اوراق میں ہوتی رہی ہیں، مگر ایک سوال زیرِ بحث نہیں آیا۔ وہ یہ کہ داعیانِ حق کا کردار کیا ہونا چاہیے۔ یوں تو داعیانِ حق کے کردار کا تصور اتنا وسیع ہے کہ اس میں ایک مومنِ متقی کے سارے ہی اوصاف آجاتے ہیں، خصوصاً قرآن نے اپنے انسانِ مطلوب کے جا بجا جو صفاتی خاکے پیش کیے ہیں اُن کو ہر اُس شخص کے لیے معیار رہنا لازم ہے جو خدا کی راہ میں کوئی دعوتی کام کرنا چاہتا ہو۔ یہاں ہم صرف چند ایسے اُمور کا ذکر کریں گے جو دعوتی لحاظ سے اُصولی اہمیت رکھتے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ دعوت الی اللہ، شہادتِ حق یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہمارا کوئی ذاتی کام نہیں جسے ہم نے خود ہی سوچا ہو، اُس کی راہیں خود ہی تجویز کی ہوں اور اپنے مفاد اور جذبات کی ضروریات کے تحت اُس کے اُصول و مقاصد متعین کیے ہوں۔ یہ خدا کا اپنا کام ہے اور اسی نے اس کام کو کرنے کا اپنے بندوں سے مطالبہ کیا ہے، اسی نے اس کے اُصول و مقاصد مقرر کیے ہیں، اسی نے اس کے لیے موزوں پیرایوں اور اسالیب کی نشاندہی کی ہے۔ پس اس کام کو جو لوگ کرنا چاہیں وہ نفسانیت سے اس معنی میں بھی پاک ہوں کہ وہ اپنی اُمنگوں اور جذبات کی تسکین کی فکر نہ کریں، اور اس لحاظ سے بھی پاک ہوں کہ وہ خدا و رسولؐ سے ہدایات لینے کے بجائے اپنے لیے خود ہی طور طریقے وضع کر لیں۔ اجتہادی تدابیر کا میدان ہر شعبۂ کار میں شریعت نے رکھا ہے، مگر ایک تو اُصول و حدود واضح طور پر طے کر دیے ہیں اور دوسرے کسی ایسے اجتہاد کا کوئی جواز نہیں چھوڑا جو شرعی اُصول و حدود کے دائرے سے باہر نکل

جائے - گویا یہ مقام اخلاص کا مقام ہے - اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا کام اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں پر اللہ کے لیے کیا جائے - کام اگر اللہ کا نہ ہو تو بھی سب کچھ غارت، اللہ کے مقررہ طریقوں پر نہ ہو تو بھی عبث اور اللہ کے لیے نہ ہو تو بھی ہباءً منثورا۔

دوسری بات یہ کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات و تلقینات تقاضا کرتی ہیں کہ جنہیں اللہ کا بتایا ہوا کارِ دعوت کرنا ہو وہ اللہ سے گہرا دلی رشتہ استوار کریں، اس کی عبادات پوری کریں، اس کے لیے حمد و ثنا کریں، اس کا ذکر جاری رکھیں، اس کے سامنے بار بار اپنا دل کھول کر رکھیں، اپنی ناچیز خدمات کی قبولیت کی تمنا کریں، اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر اس سے معافی مانگیں، اس کے لیے نوافل ادا کریں، اس کی راہ میں مال خرچ کریں، اس کی مسجدوں سے لو لگائیں، اس کے بندوں کے لیے خادم بنیں اور یہ جانیں کہ دعوت الی اللہ سب سے بڑی خدمتِ خلق ہے۔ قرآن کو بار بار پڑھیں اور جو اصولِ دعوت اس میں مذکور ہیں اور داعیانِ حق کی جو ذمہ داریاں بیان ہوئی ہیں ان کو سمجھیں اور اختیار کریں، نیز انبیاء و صلحا کے نمونے کے کاموں سے روشنی لیں، احادیث اور سیرت کے مطالعے سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ و صحابیات کی خدماتِ دعوتِ حق کا شعور و ادراک پائیں، جن جن امور پر حضورؐ نے تربیتِ صحابہ کے دوران میں گرفت کی یا جن رویوں کی اصلاح کی ان کو الگ الگ رکھ کر سمجھیں۔ اس سلسلے میں ائمہ و علما نے جو لٹریچر تیار کیا ہے، اسے پڑھیں۔

خدا سے تعلق اگر اس طرح کا گہرا نہ ہو بلکہ دو چار سجدوں اور دس پانچ اجتماعات ہی پر سارا دار و مدار رکھا جائے تو اندیشہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں سرگرم ترین داعیانِ حق کسی نہ کسی امتحانی مرحلے میں پھسل جائیں گے اور ایسی چوٹ کھائیں گے کہ کیا کرایا سارا درہم برہم ہو کے رہ جائے گا۔

خدا اور رسولؐ سے گہرا اور سچا قلبی تعلق رکھنے والا آدمی قرآن و حدیث کی کوئی بات سن کر موجودہ عدالتی نظام کے وکلا کی طرح بحثیں اور تاویلیں نہیں کرتا، بلکہ اس کی کیفیت یہ ہوتی

ہے کہ "اِذَا تُلِيَتۡ عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُنَا وَجِلَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ" خدا کی آیات سن کر سچے خدا پرستوں کے دل لرز اٹھتے ہیں۔ اور وہ قرآن سننے والے سے الجھنے کے بجائے یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کہیں واقعی ہم سے کوئی خلاف ورزی تو نہیں ہو گئی۔ ایسے مواقع پر معاملہ اپنا دفاع کرنے کا نہیں ہوتا (اگر چہ کبھی کبھار اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے جب کہ بات کرنے والا قرآن کے منطوق کو صحیح نہ سمجھ رہا ہو یا وہ مخاطب کے متعلق غلط فہمی رکھتا ہو) بلکہ ضرورت اپنا احتساب کرنے کی ہوتی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایسی مثالیں شاذ ہی شاید ملی ہوں کہ کسی نے آیت یا حدیث کو سن کر یہ کہا ہو کہ میں اس کے آگے سر تسلیم خم کر کے اپنے موقف سے دستبردار ہوتا ہوں یا اس لمحے مجھ پر منکشف ہو گیا کہ فلاں معاملے میں میرا طرز فکر غلط تھا۔ آدمی کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنا دفاع جھگڑالو ہونے کی حد تک کرتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت گہرے تعلق باللہ کی عدم موجودگی میں ہوتی ہے۔ داعیانِ حق کو خیال رکھنا چاہیے کہ قرآن کو ہماری دعوتی اور اجتماعی سرگرمیوں کے اوپر اوپر سے نہ گذر جانا چاہیے اور ہمیں اور ہمارے کام کو قرآن کی حقیقی برکات سے محروم نہ رہ جانا چاہیے۔

دعوتِ حق کے بیج سے یقیناً ایک سیاست بھی نمودار ہوتی ہے اور ایک نظام بھی پیدا ہوتا ہے، مگر فی نفسہٖ دعوت ایک سیاسی مشغلہ نہیں ہے۔ اور ہمارے ہاں تو خود سیاست بھی ایک دینی فریضہ ہے، لہٰذا سیاست بھی غیر سیاسی ہے۔ غیر سیاسی سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ کوئی خانقاہی سرگرمی ہے اور اس میں کشمکش کا کوئی دخل نہیں، بلکہ اصل مدعا یہ ہے کہ جس ذہنیت اور جس اسلوب سے دنیا کے سیاست کار اور سیاست باز سیاست چلاتے ہیں وہ ہمارا طریقہ نہیں ہے۔ ہماری سیاست کا بھی اپنا ایک نہج ہے۔ ہمارا سیاسی سرگرمی سے مقصود بھی رضائے الٰہی ہے جس کا معیاری مرتبہ حصول "لِيَكُوۡنَ الدِّيۡنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ" کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ہاں تو اصل بات ہو رہی تھی دعوت کی ــــ باوجودیکہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور کفر بالطاغوت کی دعوت کامل درجے کی سیاسی نوعیت رکھتی ہے، مگر اس کا طریقۂ فروغ سیاسی جدوجہد سے مختلف ہے۔ ہماری دعوت نعرہ بازی کا سلسلہ نہیں ہے، یہ کوئی دھونس جمانے کا ہتھیار نہیں ہے، بلکہ دعوت کا سارا کام معلمانہ نوعیت کا ہے۔ سچا معلم خلقِ خدا سے گہری محبت رکھتا ہے، وہ لوگوں کا بہترین خیر خواہ ہونے کی وجہ سے ان کی دنیا

کو بھی سنوارنا چاہتا ہے اور ان کی عاقبت کو بھی جیسے کہ پہلے کہا گیا۔ یہ اوّل درجے کی خدمت ہے۔ داعیٔ حق جہاں بات ماننے والوں کو سینے سے لگاتا ہے، وہاں وہ نہ ماننے اور مخالفت کرنے والوں کو یہ الاؤنس دیتا ہے کہ اِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ انہیں اپنے بھلے بُرے کا پتہ نہیں ہے۔ اُن کی سمجھ سے ابھی تک یہ بات بالاتر ہے کہ خدا کے دین کا پیغام ان کو بیڑیوں اور بوجھوں سے نجات دلانے کے لیے ہے۔ وہ گالیاں دینے، استہزاء کرنے اور ظلم ڈھانے والے مخالفین کے لیے بھی یہی سوچتا ہے کہ یہ لوگ سالہا سال سے باطل افکار اور غلط عادات رسوم کے جادو سے مسحور ہیں اور اس جادو کے ٹوٹنے میں دیر لگ سکتی ہے۔

تیسری بات یہ کہ اس معلمانہ اور محبانہ کام میں صبر ایک شرط لازم ہے۔ اپنے صحیح کام پر اور اس کے اصولوں پر جمے رہنے کے لیے صبر چاہیے اور دوسروں کی زیادتیوں کے جواب میں ہاتھ نہ اٹھانے کے لیے صبر چاہیے[1]۔ وہ لوگ جو دعوت کا معلمانہ کام کرتے ہوئے دوسروں کی فضول باتوں یا اُن کے مظالم پر اشتعال میں آجائیں اور مخالفین سے انتقام لینے لگیں، وہ اپنے متعلق ثابت کر دیتے ہیں کہ وہ خدا کے دین کی طویل اور مردافگن مہم میں صحیح حصہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ مخالفین کی غلطیوں کو اپنی غلطیوں کے جواز کی دلیل بنانا داعیانِ حق کا کام نہیں ہے۔ داعیانِ حق میں اتنا ظرف ہونا چاہیے کہ وہ یاس انگیز مخالفانہ ماحول میں کبھی گھبرائیں نہیں، گھبرا کر جذباتی توازن نہ کھوئیں، مخالف افراد اور اداروں کے ذرائع و وسائل اور قوتوں سے مرعوب

---

[1] مرحلہ جہاد کی بات کو بعض لوگ دعوت کی مہم پر منطبق کرتے ہیں، حالانکہ جہاد بہ معنی قتال ایک ایسی جماعت ہی کر سکتی ہے جس کی قیادت اغیار کی مداخلت سے آزاد ہو اور اس جہاد کے لیے شرط لازم ہے کہ کارِ دعوت کو اتمامِ حجت کی حد تک پہنچا دیا گیا ہو۔ پھر قتال محدود ہوتا ہے میدانِ جنگ تک۔ نہ یہ کہ جو بات نہ مانے وہ جہاں ملے اس کا سر اڑا دیا جائے۔

نہ ہوں، معاندوں کی اشتعال انگیز حرکات سے بارود کی طرح بھک سے اُڑ جائیں، بلکہ یقین رکھیں کہ خیر خواہی اور نیکی کے جذبے سے بے لوث کام کرنے والے جب تک مظلومی کے مقام پر رہتے ہیں اُن کا پیغام پھیلتا جاتا ہے اور اُن کے لیے ہمدردیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اُن کے لیے غیر جانب دار عناصر میں بھی اور خود مخالف گروہوں میں بھی ایک دھیمی دھیمی اور دبی دبی حمایت نشوونما پاتی رہتی ہے جو خاصی دیر میں کسی خاص موقع پر سامنے بھی آجاتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر داعیانِ حق دسیوں سال صابرانہ کام کرتے کرتے کسی ایک موقع پر جارحانہ یا ظالمانہ اقدام کی تہمت کا نشانہ بن جائیں تو انہیں بہت بڑا نقصان پہنچتا ہے، خواہ وہ نقصان ابتدا ہی میں پوری طرح واضح نہ ہو۔ معلم اگر ایک بار رضا نبدارہ کا ڈنڈا حرکت میں لے آئے تو پھر محبت و خدمت کی بنا پر حاصل ہونے والی قدر و قیمت میں ایسی کمی آجاتی ہے جس کا پورا ہونا تادیر مشکل ہوتا ہے۔ جب تک دعوت دینے کا کام کرنا ہو، مظلومانہ مقام پر رہ کر خوشی خوشی سے زخموں کو سینے سے لگائے رہیے۔ اور مظالم کے حسابات چکانے کا کام اللہ پر چھوڑ دیجیے (وعلینا الحساب) اور اگر "النفس بالنفس والسن بالسن" کے اُصول پر آپ اپنے حسابات روز کے روز چکانا چاہتے ہوں تو پھر اسی کام میں لگے رہیے، دعوتِ حق کی علمبرداری کو دوسرے مناسب لوگوں کے لیے چھوڑ دیجیے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ داعی کوئی فرد ہو یا کوئی گروہ، برسوں میں اس کا کردار ایک خاص شکل اختیار کرتا ہے، اور وہ اپنے امتیازی خدوخال کے ساتھ پہچانا جانے لگتا ہے۔ اس کردار کا بنیادی ڈھانچہ صدق، دیانت اور عدل کی صفات سے بنتا ہے۔ اِس کردار سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا اور اُسے بغیر مسخ کیے برقرار رکھنا، شروع سے آخر تک صبر چاہتا ہے، مثلاً سچ بولتے بولتے اگر ایک بار ...... داعیٔ حق فرد یا گروہ جھوٹ بول دیتا ہے تو گویا وہ اپنے برسوں کے پرورش کردہ کردار کو خود ہی ایک ایسا زخم لگاتا ہے جسے کوئی مرہم مندمل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح عدل کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کی برائیوں کے ساتھ اُن کی خوبیوں کا بھی اعتراف کیا جائے۔

اور دوسروں کو ان کی غلطیوں پر ٹوکنے والے داعیوں کو خود اپنی غلطیوں پر زیادہ سختی سے گرفت کرنی چاہیے - دوسروں کا احتساب کرنے کی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے، مگر اپنا احتساب کرنا تو شرعی ذمہ داری ہے - ضمیر اگر زندہ ہو تو نہ اس کی آواز کو دبایئے اور نہ اس کے منہ میں مٹی ڈالیے بلکہ اس کی آواز کو اپنی آواز بنا کر اعتراف کر لیجیے کہ ہم سے غلطی ہوئی - اور جس کے حق میں غلطی ہوئی ہو اس سے معافی مانگ لیجیے - دنیا میں ایک طریقہ یہ بھی رائج ہے کہ کسی بڑی کوتاہی اور غلطی پہ لوگ قیادت یا عہدوں سے مستعفی ہو جاتے ہیں، اس طرح کے استعفیٰ بھی دراصل اس بات کا اعلان ہوتے ہیں کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے۔

عدل ہی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اگر کوئی موقع بالفرض کسی کے ساتھ تصادم کا پیدا ہو ہی جائے تو کسی کی زیادتی کی جوابی کارروائی ہرگز اس کی زیادتی سے بڑھ کر نہ ہو - داعی کا اصل مقام تو معاف کرنا ہے، لیکن استثنائی طور پر کوئی ایسی صورت پیدا ہو ہی جائے کہ کسی کی ظالمانہ حرکت کا دفاع کرنا پڑ جائے تو اصول یہ ہے کہ " فاعتدوا علیھم بمثل ما اعتدی علیکم" نیز قرآن کی یہ ہدایت بڑی جامع ہے کہ " ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا " یعنی کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ اکسا دے کہ تم انصاف ہی سے کام نہ لو۔

مختصر یہ کہ صدق، دیانت اور عدل پر سختی سے کاربند رہنا اہلِ دعوتِ حق کے لیے ضروری ہے۔

پانچویں بات یہ کہ دین کے ہر کام کی طرح دعوتِ اساسی کا کام بھی اس کام کے شرکا کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیے - داعیانِ حق کو مشورے سے اپنے لیے دعوت کا منصوبہ تیار کرنا چاہیے - مشورے ہی سے ہر خاص مرحلے کی کارروائی کا فیصلہ ہونا چاہیے اور کام پر نکلنے سے پہلے ہدف مقصود اور طریقِ کار متعین ہونا چاہیے - یہ نہیں کہ میدانِ دعوت کے شہسواروں کو پتہ ہی نہ ہو کہ آج وہ کس غرض سے نکلے ہیں - اور اچانک چلتے چلتے انہیں اشتعال آجائے اور پھر بے اختیارانہ طور پر ان سے بعض حرکات صادر ہو جائیں - یہ کام تو مجذوبوں کا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے وہ جب جو چاہیں کہہ دیں اور جو چاہیں کر بیٹھیں - ذی شعور اور

ہوش مند داعیانِ حق کا راستہ مجذوبوں کا راستہ نہیں ہے ۔

چھٹی بات یہ کہ لفظ انقلاب کو بھی مشورے اور منصوبہ بندی کی کوتاہیوں کی ڈھال نہیں بنایا جا سکتا اور نہ انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ کام کرنے والے جو ہنگامہ چاہیں کھڑا کر دیں، سب روا ہے ۔ انقلاب کے لفظ سے اس دور میں جو غیر اسلامی مطالب وابستہ ہو گئے ہیں، ہمارے دل و دماغ کو ان کے جنگل میں نہیں پھنسنا چاہیے ۔ اسلامی دعوت کے انقلابی ہونے کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ صرف وعظ نہیں ہوتی بلکہ تبدیلی کا پیغام ہوتی ہے ۔ اور تبدیلی بھی وہ فقط فرد کی زندگی میں نہیں چاہتی بلکہ اجتماعی نظام میں چاہتی ہے ۔ لیکن اسلام کی انقلابیت یہ معنی نہیں رکھتی کہ کام کرنے کے نہ کوئی اصول ہیں، نہ حدود، نہ اخلاقیات اور نہ کسی مشورے کی ضرورت ہے، نہ تدبیر کی، نہ حکمت کی، نہ مصلحت کی، نہ منصوبہ بندی کی، اسلامی انقلابیت کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ داعیانِ حق جدھر چاہیں چڑھ دوڑیں اور جس کی گردن چاہیں ناپ دیں، اسلام کا داعی تو برسوں پس پس کر تبدیلی لانے کی قوت حاصل کرتا ہے ۔

ساتویں بات یہ کہ اسلام کی خدمت کرنے کے لیے نوجوانی کا دور بہترین دور ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ نوجوان اپنی ابلتی، امڈتی ہوئی ذہنی اور جذباتی قوتوں کو انضباط میں رکھ سکیں ۔ قرآن بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت پر لبیک کہنے والے، بالعموم نوجوان تھے ۔ حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ و ہارون پر ایمان لانے والوں کے علاوہ اصحاب کہف بھی نوجوان ہی تھے ۔ حضورؐ کی تحریک کو بھی نوجوانوں ہی نے آگے بڑھایا ۔ اور پورا اسلامی انقلاب نوجوانوں کی پوری ایک نسل کی قربانیوں کا ثمرہ ہے ۔ لیکن یہ سارے نوجوان ایسے تھے جنہوں نے اپنے آپ کو مرضیاتِ الٰہیہ میں جکڑ لیا تھا ۔ حدیث میں خدا کی طرف سے ایسے ہر نوجوان کے لیے قیامت کے دن سایۂ عرشِ الٰہی میں جگہ دینے کا وعدہ ہے ۔ جس کو حسب نصیب (باقی بر صفحہ ۵۳)